پیش لفظ

عروض، بیان اور بلاغت تنقید کے ادبی معیارات ہیں، انھیں ادب میں کلیدی اور قواعدی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں ادب کو محض ادبی معیاروں پر پرکھنا ناکافی سمجھا جاتا ہے اور اسے غیر ادبی معیاروں (مثلاً سائنسی یا فلسفیانہ) کی روشنی میں جانچنا بھی لازمی خیال کیا جاتا ہے لیکن اس طرح کے نظریات کے فروغ کے باوجود خالص ادبی معیاروں کی حیثیت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا ہے کیوں کہ اتنی بات طے ہے کہ ادب پہلے ادب ہے اور بعد میں کچھ اور۔ ادب کو غیر ادبی معیاروں پر پرکھنے کے نظریے کو پہلے پہل انگریزی ادبیات میں فروغ ملا اور بعد ازاں یہ اردو میں داخل ہوا لیکن انگریزی ادبیات میں ابھی تک ادبی معیاروں کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ اگر عروض بیان و بلاغت جیسے عنوانات ہی پر نظر ڈالیں تو انگریزی میں Rhetoric & Prosody جیسے عنوانات پر آج بھی عالمی سطح کے سیمینار اور ورک شاپ منعقد ہو رہے ہیں۔ Prosody & Meanings جیسی کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں، Suprasegmental elements جیسے عنوانات سے رسائل میں مضامین چھپ رہے ہیں اور اس طرح کے کئی اہم موضوعات جامعات کے نصاب میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی شعبوں میں بھی زندہ ہیں۔ انگریزی ہی کی طرح عربی و فارسی میں بھی ان معیارات کو قدر و منزلت حاصل ہے مگر اُردو میں صورتِ حال تشویش ناک ہے۔

آج اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے سہارے تحقیقی و تنقیدی سرگرمیاں آسمان چھو رہی ہیں۔ تمام علوم و فنون کی طرح اردو زبان و ادب کے تحقیقی شعبے بھی نئے نئے امکانات سر کر رہے ہیں لیکن ایک مایوس کن صورت یہ ہے کہ اردو ادب میں خالص ادبی معیاروں کی طرف آئے دن تحقیق کا جھکاؤ کم ہوتا جا رہا ہے۔ ادب کی صحت و سلامتی اور حیات و ثبات کے لیے تحقیقی و تنقیدی مطالعات کی اہمیت مخفی نہیں ہے اور پھر جامعات میں ہونے والے تحقیقی اعمال تو زبان و ادب کی بقا کے ضامن ہیں لیکن آج جامعات میں ادبی نصاب ہو یا تحقیقی میلان دونوں ہی میں بیان، بلاغت اور عروض جیسے فنی موضوعات سے دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ اب تو حد یہ ہے کہ تحقیق کا جھکاؤ شاعری کے مقابلے میں نثر کی طرف زیادہ ہے۔ حالاں کہ اردو ادب میں شاعری کا بحر بیکراں موجود ہے اور آج بھی شاعری کی تخلیقی سرگرمیاں نثر کے مقابلے میں زیادہ ہی ہیں لیکن جامعات کے اُردو شعبوں میں شاعری پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالرس پندرہ بیس فی صد سے زیادہ نہیں ہوتے ہیں اور ان میں سے بھی اکثر کا کام شعرا کی حیات اور خدمات جیسے رسمی عنوانات ہی تک محدود ہوتا ہے جب کہ فنی اور جمالیاتی سطح پر شاذ ہی کام نظر آتا ہے۔ اگر فنِ شاعری پر کام کی

رفتار اسی طرح سست ہوتی رہی تو شاعری کی فنی جمالیات کا مستقبل تاریک ہونا یقینی ہے۔

شعر و ادب کے وہ موضوعات خاص طور سے عدم توجہی کا شکار ہو رہے ہیں جو زیادہ دقتِ نظری، مشقت اور ریاضت کا تقاضہ کرتے ہیں۔ عروض سے چشم پوشی کی بنیادی وجہ بھی یہی ہو سکتی ہے حالاں کہ یہ علم اس قدر دشوار اور مشکل نہیں ہے، جس قدر اس کی دشواری اور مشکل پسندی کے چرچے ہیں۔ یہ مشقت اور ریاضت کا فن ضرور ہے لیکن دیگر فنون ہی کی طرح نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ معروضی مزاج کی وجہ سے آسان بھی ہے البتہ اس کی اصطلاحات مشکل ہیں اور عروضیوں کے آپسی اختلافات نے اس کی پیچیدگیوں کو مزید ہوا دی ہے۔ اردو میں عروض چوں کہ عربی اور فارسی سے مستعار ہے لہٰذا اس کی اصطلاحات بھی انھیں زبانوں سے آئی ہیں جو اردو والوں کے لیے کافی حد تک غیر مانوس ہو سکتی ہیں لیکن یہ معاملہ صرف عروض ہی کا نہیں بہت سے باقی علوم میں بھی مشکل اور مبہم اصطلاحات رائج ہیں۔ علمِ طب کی مثال لیجیے کہ دنیا بھر میں میڈیکل کی تعلیم انگریزی زبان میں عام ہے لیکن اصطلاحات یونان، چین، مصر و ایران کی زبانوں کے مخلوط لسانی نظام سے تشکیل پزیر ہیں۔ جو لوگ اس علم کی اہمیت و افادیت سے واقف ہیں اور اس کے حصول کی دلچسپی رکھتے ہیں وہ ان مشکلوں کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موزونیت کے بحر بے کراں میں غواصی کا شوق رکھنے والے بھی اس علم کے حصول کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔

ان تمام باتوں اور مسائل کے مد نظر اور اپنی عروضی دلچسپی کے پیشِ نظر عاجز نے پی ایچ ڈی کے لیے بیان، بلاغت اور عروض کے موضوع کو منتخب کیا۔ اس موضوع کے انتخاب کی روداد کا مختصر حال یوں ہے کہ عاجز نے مارچ ۲۰۲۱ء میں اپنے ایم فل کا مقالہ ''بشیر بدؔر کے شعری مجموعے **آسمان** کا فنی و فکری تجزیہ'' مکمل کر کے شعبے میں جمع (Submit) کیا۔ اس وقت تمام دنیا کرونا وائرس کی زد میں اُفتاں و خیزاں تھی اسی وجہ سے میرے ایم فل کا وائیوا (Viva) تاخیر سے ہوا۔ اس تاخیر کے سبب فرصت کے لمحات میسر آئے تو میں نے اطمینان سے پی ایچ ڈی کے موضوع کے بارے میں غور و خوض شروع کیا اور ذاتی طور پر یہ طے کیا کہ پی ایچ ڈی کا موضوع **جدید غزل کا عروضی نظام** منتخب کیا جائے۔ نومبر ۲۰۲۰ء میں ایم فل کا وائیوا (Viva) ہوا تو میری ادنیٰ سی کاوش کو گمان سے زیادہ پزیرائی ملی اور اس موضوع کو پی ایچ ڈی میں جاری رکھنے کی تجویز سامنے آئی جو مجھے بے حد پسند آئی لہٰذا میں نے **بشیر بدؔر کی غزلیات کا عروضی مطالعہ** موضوع چن لیا، جسے بعد ازاں کمیٹی نے بالاتفاقِ رائے منظور کیا۔

اس تحقیقی مقالے کا مختصر تعارف یوں ہے کہ یہ بشیر بدؔر کی غزلیات کی بالخصوص عروضی جہت اور بالعموم ان کی تمام فکری و فنی جہات کے مطالعے کو محیط ہے۔ یوں تو کسی کلام کے عروضی مطالعے میں صرف

فاعلاتن فاعلات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں اس کے وسیع تر معنوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بیان و بلاغت کے تمام اجزا کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان سبھی اجزا کا تجزیہ نامکمل رہتا اگر شاعر کی فکری جہات کو زیر بحث نہیں لایا جاتا لہٰذا ان کی فکری جہات کا مطالعہ بھی اس مقالے کا ناگزیر حصہ ہے اور اسی ضرورت کے پیشِ نظر جدیدیت اور جدید غزل کے موضوع کو بھی شاملِ مقالہ کیا گیا ہے۔ بشیر بدرؔ کے عروضی مطالعے سے قبل علم عروض اور پنگل شاستر کی اساسی بحثوں اور پیمانوں، شاعری موزونیت و موسیقیت کے رشتے اور اجزائے بیان و بلاغت کا محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔

موضوع کے ساتھ انصاف کر پایا ہوں یا نہیں؟ اس کا فیصلہ ممتحن حضرات کریں گے البتہ میں اپنی کمزوریوں پر نادم ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات پر مسرور ہوں کہ میں نے اس کام کو سرانجام دینے کے لیے ہر ممکنہ کوشش سے کام لیا ہے۔

اللہ کا شکر و احسان ہے کہ آج یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا اور مجھے امید ہے کہ آگے کے تمام مراحل بھی اللہ کے فضل و کرم سے بآسانی سر ہوں گے۔ خدا کی حمد و ثنا اور حبیب خدا حضرت محمد ﷺ پر صلوٰۃ و سلام کے بعد مجھ پر اپنے مرحومین والدین کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ آج اگر وہ باحیات ہوتے تو یقیناً خوش ہوتے لیکن وہ مجھے کم سنی ہی میں تقدیر سے مجبور حیف و حسرت کے عالم میں کتابِ زندگی کا دقیق مطالعہ کرنے کے لیے چھوڑ گئے۔ اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین!

ہر انسان کی طرح میری زندگی بھی اُن تمام اساتذہ کے احسانات سے گراں بار ہے، جنھوں نے طفلِ مکتب سے لے کر یونی ورسٹی تک میری ذہنی نشو و نما کی ہے۔ ان تمام کا نام بہ نام تذکرہ یہاں ممکن نہیں ہے۔ البتہ میرے تحقیقی نگراں اور استاذ محترم ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی کے ذکرِ خیر کے بغیر یہ مقالہ مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔ میں نے ان کے تبحرِ علمی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور کردار سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہاں تفصیل کا محل نہیں ہے؛ صرف اس اعتراف کے ساتھ میں بات سمیٹتا ہوں کہ اگر اس مقالے میں کوئی سدھار ہے وہ انھیں کی بدولت ہے اور خامیوں کے لیے میری کوتاہیاں ذمہ دار ہیں کیوں کہ انھوں نے اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ میں صمیمِ قلب سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے قدم قدم پر میری اصلاح، تربیت اور اعانت کی ہے۔ ان کی سرپرستی حاصل ہونا میں اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔ حسن اتفاق یہ ہے کہ میرے مقالے کی تکمیل کے ساتھ ہی ان کا تقرر جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو گیا۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

میں مرکزی دانش گاہِ کشمیر، بالخصوص یہاں کے اسکول آف لینگویجز اور شعبۂ اردو کا مشکور ہوں جہاں تحقیق کا میدان میسر آیا، تحقیقی وسائل دستیاب ہوئے اور ان سے بڑھ کر یہ کہ مجھے یہاں اردو زبان و ادب کی بلند قامت شخصیات کی صحبت نصیب رہی، جن میں سابق ڈین اسکول آف لینگویجز پروفیسر محمد غیاث الدین صاحب، صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عرفان احمد ملک صاحب، ماہرِ لسانیات و فنِ شاعری ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی صاحب، ماہرِ عروضی و فن شاعری ڈاکٹر محمد راشد عزیز صاحب، تانیثیت کی علم بردار محترمہ ڈاکٹر نصرت جبین صاحبہ، تصوف کے شناساں ڈاکٹر الطاف احمد نقشبندی صاحب۔ میں ان سبھی کا ممنون ہوں۔ اس کے علاوہ میں یہاں کے تمام ارباب حل و عقد کا مشکور ہوں، جنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں اس سفر میں میرا ساتھ دیا۔

شعبے کے اسکالرس میں ڈاکٹر لعل محمد، ڈاکٹر اشفاق احمد، ڈاکٹر عرفان الحسن مہدی، ڈاکٹر مختار احمد میر، ڈاکٹر مختار احمد فانی، عزیزم محمد ابرار اور محترم پرویز احمد کا مشکور ہوں، جنھوں نے مواد کی فراہمی، پروف ریڈنگ اور دیگر کئی مراحل میں میرا ساتھ دیا اور کچھ دوستانہ یادیں بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اپنی شریک حیات محترمہ ملکہ فاطمہ کا مشکور ہوں، جس نے اس سفر میں بڑھ چڑھ کر ساتھ نبھایا۔ میں اپنے تمام دوستوں اور عزیز و اقارب کا بھی ممنون ہوں جن کی دعائیں شاملِ حال رہیں۔

میں مرکزی جامعۂ کشمیر کی سینٹرل لائبریری، اردو لائبریری، کشمیر یونی ورسٹی کشمیر کی شعبۂ اردو کی لائبریری، اقبال لائبریری، جموں یونی ورسٹی جموں کی اردو لائبریری اور درجنوں ویب گاہوں بالخصوص ریختہ آن لائن، عروض ڈاٹ کام اور استاذ محترم پرویز احمد اعظمی کے واٹس ایپ اور ٹیلی گرام چینل ''القلم'' کا جہاں سے مجھے بھرپور مواد موصول ہوتا رہا۔ ان تمام کتب خانوں اور ان کے کارکنان کا مشکور ہوں کہ انھوں نے وقت پر مواد فراہم کر کے مجھے بہت سی الجھنوں سے بچا لیا۔ میں شعبۂ اردو کے کارکنان بالخصوص منصور احمد اور عظمیٰ کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ انھیں کے ہاتھوں تمام کام اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔

ریسرچ کی دنیا میں قدم رکھنا میری زندگی کا دیرینہ خواب تھا جسے اب شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھ کر دل مطمئن اور مسرور ہے۔ میں اس فرحت بخش موقعے پر تین اہم ہستیوں کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں، جنھیں میں اپنی ہر کامیابی کا وسیلہ سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے میں اپنے آبائی علاقہ بھلیسہ کی روحانی اور علم پرور شخصیت سیدی و مرشدی قبلہ غلام قادر غنی پوریؒ کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، جنھوں نے ہمارے پس ماندہ خطے میں اپنے خون جگر سے علم و عمل اور رشد و ہدایت کی شمع فروزاں کی۔ آپؒ کی تاریخ ساز شخصیت فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ اور شوکتِ سنجر و سلیم کی آئینہ دار تھی۔ آپؒ اپنے نورِ بصیرت اور بے پناہ جوہرِ محبت سے بلا تفریقِ مذہب و ملت ہمیشہ مظلوموں، لاچاروں اور مفلسوں کی حمایت و چارہ سازی کرتے رہے اور حصولِ علم کو انسان کی

مجموعی تعمیر و ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے، اس کی عملی جدوجہد میں مصروفِ عمل رہے۔ ۲۴/ جولائی ۲۰۱۴ء کو آپ کے وصالِ حق ہونے سے جہاں پورا علاقہ خود کو یتیم محسوس کر رہا تھا وہاں میں بھی نہ صرف دوبارہ یتیم ہو گیا تھا بلکہ زندگی کے حقائق سے نبرد آزمائی کا حوصلہ بھی ہار بیٹھا تھا لیکن آپؒ ہی کے فیضانِ نظر کے نتیجے میں مجھے ایک پیکرِ خلوص رندِ پاک باز محسن میسر آیا، جس نے اپنے جگر کے لہو سے میرے ٹمٹماتے چراغ کو روشن رکھا اور مجھ پر بے شمار احسان کیے، جن میں سب سے بڑا احسان میں یہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مجھے پھر سے علم کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے بے شمار قربانیاں دیں۔ اس رندِ پاک باز کا نام ظاہر کرنے کی مجھے اجازت نہ مل سکی۔ تعارف کے لیے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ محترم بظاہر خرقہ پوش تو نہیں ہیں لیکن آستین میں یدِ بیضا لیے پھرتے ہیں۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے یہاں تک پہنچانے میں ان کا کلیدی رول رہا ہے۔ مقدر نے ان سے کیسے ملایا اور ان کی مجھ پر کیا کیا نوازشات رہیں، اس کا مفصل ذکر کسی مضمون میں ضرور رقم کروں گا۔ انھوں نے مجھ پر ایک اور احسان یہ کیا کہ رازِ کن فکاں سے معمور ہستی سیدی یوسف صاحب وارثی مدظلہ العالی کے دامنِ عافیت میں پناہ دلائی، جن کی نگاہِ دل پذیر مجھ ناکارہ پر ملتفت ہے۔ انھیں شانِ فقر کی وہ مسندِ اعلیٰ نصیب ہے، جس کے بارے میں اقبالؔ نے کہا تھا ؎ اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہاں گیری! بہر حال ان عظیم ہستیوں پر مزید لکھنے سے قلم پاسِ ادب سے خاموش رہنا چاہتا ہے لیکن مجھے یہ کہے بغیر سکون بھی نہیں ملتا کہ میری کمزوریاں اور کوتاہیاں ایک طرف میری تمام تر کامیابیاں انھیں شخصیات کی نگاہ کے صدقے ہیں۔

عمل کی میرے اساس کیا ہے بجز ندامت کے پاس کیا ہے
رہے سلامت تمہاری نسبت میرا تو اک آسرا یہی ہے
عطا کیا مجھ کو دردِ الفت کہاں تھی یہ پرُ خطا کی قسمت
میں اس کرم کے کہاں تھا قابل حضور کی بندہ پروری ہے

شمس نیازی
گاندربل، کشمیر۔ انڈیا
۲۸/ اگست، ۲۰۲۳ء

OOO